Research Journal
Tahqeeqat

eISSN: 2791-0342
pISSN: 2791-0334

ریسرچ جرنل
تحقیقات

ربندرناتھ ٹیگور کے ناول "گورا" کا مابعد نوآبادیاتی مطالعہ

Postcolonial Study of Rabindranath Tagore's Novel Gora

Muhammad Azam
Lecturer, National University of Modern Languages, Islamabad

محمد اعظم
لیکچرار، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

Abstract

This research article investigates the postcolonial aspects of Rabindranath Tagore's novel Gora, a pivotal work addressing the socio-cultural and religious dynamics of colonial India. The novel delves into the transformative effects of British colonial rule, including the erosion of indigenous identities, cultural alienation, and the imposition of Western ideologies. It reflects the struggles of the colonized through the lens of mimicry, hybridity, ambivalence, and cultural differences, drawing on Homi K. Bhabha's postcolonial theories.Key characters such as Gora, Anandamoyi, and Paresh Babu embody the conflicts between tradition and modernity, faith and scepticism, and resistance and acceptance of colonial ideologies. Gora's identity crisis, Anandamoyi's tolerance and defiance of rigid social norms, and Paresh Babu's rationalism highlight the complex interplay of personal and cultural struggles in a colonized society. The narrative further critiques the divisions fostered by colonial policies, such as caste hierarchies and religious segregation, and their enduring impact on Indian society.Gora also portrays the duality of colonial mimicry—how adopting Western practices both empowers and alienates the colonized. The characters' dilemmas reflect broader societal tensions, underscoring the challenges of cultural negotiation and the loss of authentic identity.Ultimately, this paper reveals Gora as a profound critique of colonialism, advocating for social harmony, humanism, and the reclamation of indigenous cultural values. Tagore's work remains a timeless exploration of the psychological and cultural ramifications of imperialism and the resilience of human spirit in the face of subjugation.

Keywords: *Postcolonialism, Rabindranath Tagore, Homi K Bhabha, Ambivalence, Mimicry, Cultural Difference, Hybridity*

برصغیر پر انگریزوں نے تقریباسو سال سے زیادہ حکمرانی کی۔ اس دوران انہوں نے برصغیر کی تمام اقوام کے رہن سہن، تہذیب وتمدن اور زبان کو تبدیل کر دیا۔ ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھادی گئی کہ برصغیر کی تہذیب وتمدن اور تعلیم وغیرہ انگریزی تہذیب وتمدن سے کمتر ہے۔ اپنے مفادات کے لیے انگریزوں نے تعلیمی نصاب اور زبان دونوں کو باربار تبدیل کیا تاکہ لوگوں کو اپنی ثقافت اور زبان سے دور کر سکیں۔ لاشعوری طور پر نوآبادیاتی باشندے ان اثرات کو قبول کرتے رہے۔ مابعد نوآبادیاتی مطالعات کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ دانشورانہ نتائج حاصل کر کے ایسی حکمت عملی ترتیب دی جائے جو مقامی لوگوں کی ضروریات کے مطابق ہو۔ یہ مطالعات ثقافتی، لسانی، معاشی اور سیاسی نظریات کی دوبارہ تشکیل کر سکیں۔ مابعد نوآبادی مطالعے کی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر روش ندیم لکھتے ہیں:

> "نوآبادیات کی طویل تاریخ اور اس کے ہمہ گیر اثرات کے باعث نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی مطالعات وتجزیات اور شعور اسی لیے اہمیت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس ضمن میں ضروری ہے کہ بحیثیت پاکستانی وادی سندھ کی تاریخ کا نوآبادیات کے حوالے سے تجزیہ کیا جائے۔ تاریخ وسماجی شعور کو اجتماعی سطح پر

بلند تر کرتے ہوئے ان تمام مغالطوں سے جان چھڑائی جاسکے جو کہ مختلف نو آبادیاتی ادوار کے دوران سیاسی مفادات کے زیر اثر پروان چڑھائے گئے جو آج ہمارے عقائد اور اجتماعی شعور کا حصہ بن کر تنگ نظری وانتہاپسندی کا باعث بن رہے ہیں"۔(1)

مابعد نو آبادیاتی اثرات سے بچنے کے لیے ہر زبان کے ادبانے اپنے فن پاروں میں ان مسائل کو اجاگر کیا اور محققین اور ناقدین نے ان مابعد نو آبادیاتی عناصر کی پیش کش کو قارئین کے سامنے لانے میں اہم کردار ادا کیا۔

رابندر ناتھ ٹیگور بنگالی زبان کے معروف ادیب ہیں جنھیں دنیا بھر میں بے مثال شہرت حاصل ہوئی۔ ان کے ناولوں کا ترجمہ دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ان کے والد ایک مشہور اسکالر، سماجی کارکن اور فن کار تھے۔ اگرچہ وہ مالدار تھے، مگر سادہ زندگی گزارتے تھے۔ ان کے والد مذہبی ذہن کے آدمی تھے اور انھوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کو فلسفہ اور سنسکرت کی تعلیم گھر پر ہی دی۔ ثانوی تعلیم کے لیے انھیں بنگال اکیڈمی کی ایک درسگاہ میں داخل کرایا گیا۔ ٹیگور کو روایتی طرزِ تعلیم سے شدید نفرت تھی، اس لیے انھوں نے قانون کی تعلیم کے لیے بیرونِ ملک جانے کا ارادہ کیا۔ تاہم، وہاں بھی ان کا دل نہ لگا اور وہ ہندوستان واپس آ گئے۔

1913ء میں رابندر ناتھ ٹیگور کو ادب کے شعبے میں نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ 1915ء میں برطانوی حکومت ہند نے انھیں "سر" کا خطاب دیا، مگر پنجاب میں عوام پر برطانوی ظلم کے خلاف احتجاجاً انھوں نے یہ خطاب واپس کر دیا۔ ٹیگور نے اپنی زندگی کے آخری حصے میں تقریباً پوری متمدن دنیا کا دورہ کیا اور مختلف جگہوں پر لیکچر دیے۔ 1930ء میں "انسان کا مذہب" کے عنوان سے لندن میں کئی بلند پایہ خطبات دیے اور نیویارک میں اپنی تصویروں کی نمائش کی جو انھوں نے 68 برس کی عمر کے بعد بنائی تھیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے تین ہزار سے زائد گیت مختلف دھنوں میں ترتیب دیے، بے شمار نظمیں لکھیں، مختصر افسانے تخلیق کیے اور چند ڈرامے بھی لکھے۔ ہندوستان کی کئی جامعات اور آکسفورڈ یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ انھیں بنگالی زبان کا شیکسپیئر بھی کہا جاتا ہے۔ 1934ء کے بعد ان کی صحت بگڑ گئی اور 7 اگست 1941 کو یہ عظیم ادیب کلکتہ میں انتقال کر گئے۔

رابندر ناتھ ٹیگور نے ناول "گورا" 1910ء میں لکھا۔ اس ناول کے دنیا کی متعدد زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ سجاد ظہیر نے 1962ء میں کیا تھا۔ چونکہ یہ ترجمہ براہ راست بنگالی زبان سے نہیں تھا، اس لیے اس کا براہ راست بنگالی سے اردو میں ترجمہ ایم۔ علی نے 2015ء میں کیا۔ ایم۔ علی کا یہ ترجمہ "ٹیگور ریسرچ اینڈ ٹرانسلیشن اسکیم"، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے 2015ء میں شائع ہوا۔

اس ناول میں نو آبادیاتی اثرات نمایاں ہیں۔ نو آبادیات اس ناول کا ایک اہم اور بحث طلب پہلو ہے کہ اس میں گورا کے علاوہ کوئی ایسا کردار نہیں دکھایا گیا جو برطانوی حکومت کے خلاف احتجاج کر رہا ہو، حالانکہ ہندوستانی مسلمان استعماری حکمرانوں کے خلاف بر سرِ پیکار نظر آتے ہیں اور وہ اس کا خمیازہ بھی بھگتتے ہیں۔ مسلمانوں کے مقابلے میں برہمو سماج کے افراد نے نو آبادیات کو پوری طرح قبول کر لیا تھا اور اسے نعمت خداوندی سمجھنے لگے تھے۔ ناول میں یہ شخصیات پنو بابو، بردوادیوی اور موہم کے ذریعے ظاہر کی گئی ہیں۔ پنو بابو اور بردوادیوی کو ناول میں منفی کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جبکہ ولن کا کردار پنو بابو کا ہے جو ناول کے ہیرو گورا سے حسد کرتے ہیں اور وہ بلاواسطہ طور پر گورا سے ناول کی ہیروئن سچاریتا سے محبت کے معاملے میں مقابلہ کرتے ہیں، جہاں انہیں ہزیمت اور پسپائی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

مغربی آزادانہ تصورات کے اثرات آنند موئی پر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ یہی بات بنوئے اور گورا کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے، جو اعلیٰ انگریزی اداروں سے تعلیم یافتہ ہیں اور مغربی تعلیم اور اس کے تصورات سے فائدہ اٹھاتے ہیں، حالانکہ اسی مغربی تعلیم نے پنو بابو جیسے دقیانوسی

افراد کو بھی جنم دیا ہے۔ پورا ناول خدا، ہندوازم، اور دیگر مسائل کے بحث ومباحثے اور دلائل سے بھرا ہوا ہے۔ اس میں ہندوستان کے اصل مزاج کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا گیا ہے۔

" گورا" میں زیادہ تر ہندو کردار بنگالی ہندوؤں کے ہیں۔ کرشن دیال، آنند موئی، موہم، بنوئے، ابھناش، اور ہری موہنی خالص ہندو کردار ہیں۔ ان کرداروں میں کوئی بھی چیز مشترک نظر نہیں آتی۔ ان میں سے تین کردار کرشن دیال، موہم، اور ہری موہنی شدت پسند اور موقع پرست ہندو ہیں جو ہندوازم کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ بنوئے اور گورا پورے ناول اپنی شناخت اور پہچان کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ پاریش بابو ایک پختہ ذہن اور اعلیٰ فہم کردار ہیں جو برہمو سماج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بظاہر تو آنند موئی کسی مذہب کی پیروی کرتی نظر نہیں آتیں تاہم وہ ایک ایسی ہستی پر یقین رکھتی ہیں جس نے تمام انسانوں کو تخلیق کیا اور کائنات کا نظام چلا رہی ہے۔ موہم اور ابھناش یہ دونوں سماج کے ریاکار، منافق اور پُر فریب افراد ہیں۔

انگریزی ادب اور تنقید میں مابعد نوآبادیاتی تصورات کے حوالے سے ہومی کے بھابھا ایک منفرد حیثیت اور شناخت رکھتے ہیں۔ ادب اور تنقید میں ان کی پہچان اور انفرادیت ان کے وضع کردہ مابعد نوآبادیاتی تصورات میں ہے، جن کی وضاحت انھوں نے اپنی تصنیف "The Location of Culture" میں کی ہے جو 1994ء میں شائع ہوئی۔ انھوں نے تصور نقالی، مخلوطیت، دوجذبیت اور ثقافتی فرق جیسی نئی اصطلاحات وضع کر کے ادب اور تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ہومی کے بھابھا کے نزدیک یہ تصورات اور اصطلاحات نوآبادیاتی ادیبوں کے فن پاروں میں پائی جاتی ہیں۔

ہومی کے بھابھا کے مطابق تصور نقالی ظاہری طور پر نوآبادکاروں کا سب سے طاقتور اور دھوکہ دینے والی طاقت ہے۔ نقالی نوآبادیاتی اور مابعد نوآبادیاتی ادب میں تب دیکھی جا سکتی ہے جب نوآبادیاتی معاشرہ نوآبادکاروں کی ثقافت، سیاست، زبان اور رسم ورواج کو اپنا لیتا ہے۔ بعض اوقات نقالی کو بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً جب سیاہ فام شخص ایک سفید فام کی نقالی کرتا ہے تو اسے نہ صرف نوآبادیاتی معاشرے کے لوگ حقیر سمجھتے ہیں بلکہ مقامی لوگ بھی اسے ناپسندیدہ سمجھتے ہیں۔ ہومی کے بھابھا کے مطابق نقالی ایک قسم کا تاثر ہے جس میں استعمار زدہ افراد کے بناوٹی، ظاہری اور مصنوعی تاثرات عیاں ہوتے ہیں۔

ہومی کے بھابھا کے مطابق مابعد نوآبادیاتی مطالعات میں مخلوطیت وہ عمل ہے جس میں ایک ثقافت کے عناصر دوسری ثقافت میں مدغم ہو جاتے ہیں اور یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ لہٰذا ثقافتی مخلوطیت ہمیشہ ایک ثقافت کے بجائے تکثیریت کا سبب بنتی ہے۔ یوں مخلوطیت مغربی اور مشرقی ثقافت کی آمیزش کو ظاہر کرتی ہے۔ ہومی کے بھابھا کے نزدیک نوآبادکار اسے تخریبی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہے، جبکہ نوآبادیاتی باشندے اس مزاحمت کو چیلنج کرتے ہیں۔

ثقافتی فرق کا تصور بنیادی طور پر دو ثقافتوں کی تقسیم پر مبنی ہوتا ہے جس میں ہم ماضی اور حال کی روایات کا تعین کرتے ہیں۔ نوآبادیاتی کلامیے میں یہ ایک آمریت پسندانہ رویہ ہے۔

ہومی کے بھابھا کے مطابق تصور دوجذبیت دراصل نوآبادکار اور نوآبادیات کے درمیان وہ تعلق ہے جو بنیادی طور پر مفاہمت اور مزاحمت پر منحصر ہوتا ہے۔ ہومی کے بھابھا کے مطابق ادب میں تصور دوجذبیت ایک نوآبادیاتی کلامیہ ہے جس کے تحت نوآبادکار اور نوآبادیات کی دنیا آپس میں جڑی ہوتی ہے۔ اس کلامیے میں صرف مزاحمت یا صرف متابعت نہیں ہوتی بلکہ دونوں کی آمیزش ہوتی ہے جس کی وجہ سے متضاد جذبات اور خیالات پیدا ہوتے ہیں۔

اگر ربندرناتھ ٹیگور کے ناول "گورا" کا مابعد نو آبادیاتی جائزہ لیا جائے تو اس میں بھی ہومی کے بھابھا کے تصورات نقالی، ثقافتی فرق، مخلوطیت اور دو جذبیت پائے جاتے ہیں۔ نو آبادیاتی باشندے مختلف وجوہات کی بنا پر نقل کرتے ہیں۔ بعض اوقات نقل کرنے کا محرک محض جدید فیشن اور روشن خیالی ہوتا ہے۔ بہر حال، جس بھی وجہ سے نقل کی جائے، یہ بات واضح ہے کہ نقل کر کے وہ اپنی ثقافت اور تہذیب سے دور ہو جاتے ہیں۔ ثقافت کی سطح پر شکست مقامی باشندوں کی شکستوں کا آغاز ہوتی ہے۔ اس کے بعد نو آبادکار مقامی باشندوں کو ثقافت کے ساتھ ساتھ لسانی اور معاشرتی سطحوں پر بھی شکست سے دوچار کرتا ہے۔ ناول "گورا" میں گورا کی منہ بولی ماں آنند موئی عیسائیوں کی مانند ساڑھی کے ساتھ باڈس پہنا کرتی تھی۔ ربندرناتھ ٹیگور اپنے ناول "گورا" میں لکھتے ہیں:

"ایک چیز جو ان کی شخصیت کے ساتھ یکایک محسوس ہوتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ ساڑھی کے ساتھ باڈس بھی پہنتی تھیں۔ ہم جس زمانے کی بات کر رہے ہیں اس وقت میں کچھ نوجوان عورتوں اور لڑکیوں نے ساڑھی کے ساتھ باڈس پہننا شروع کر دی تھی لیکن پرانے زمانے کی بزرگ بیبیاں اب بھی باڈس کو بری نظر سے دیکھتی تھیں کیونکہ ان کے نزدیک یہ عیسائیت کا نشان تھا"۔(2)

نو آبادیاتی طاقتیں لوگوں کو ثقافتی بنیادوں پر تقسیم کرتی ہیں اور انھیں یہ یقین دلاتی ہیں کہ نو آبادیاتی تہذیب کے رسم و رواج دیگر تہذیبوں سے بہتر ہیں۔ "تقسیم کرو، حکومت کرو" کی حکمت عملی اپنانے کے ذریعے نو آبادیات نے سماج کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے اپنے مقاصد حاصل کیے، جسے اس وقت کے معاشرے نے نہیں سمجھا اور اس کا نتیجہ انھیں بھگتنا پڑا۔ جب انسان نے وقت اور حالات کے سنگین نتائج کا سامنا کیا تو اس نے خود ساختہ رسموں، رواجوں اور روایتوں کو توڑنا شروع کر دیا۔ آنند موئی اس کی ایک جیتی جاگتی مثال ہیں۔ انھوں نے روایتی طقوس کو توڑ کر انسانیت کو اپنا راستہ بنایا اور دوسروں کو بھی انسانیت کا سبق دینے لگیں، جب کہ سماجی پابندیاں ان کے سامنے بے اثر ہو گئیں۔ جب آنند موئی نے چھوت چھات، ذات پات اور اونچ نیچ کو ختم کیا اور سب کے ساتھ رواداری سے پیش آنے لگیں تو گورا اس پر حیران ہو گیا:

"ماں تم اتنے بڑے پنڈت کی بیٹی ہو اور تمہیں اپنے ریت رسموں کی کچھ پرواہ ہی نہیں۔ یہ تو زیادتی ہے"۔(3)

گورا کی بات سن کر آنند موئی جواب دیتی ہے:

"ایک زمانہ تھا کہ یہی تیری ماں ان سب ریتوں کی بہت پابند تھی اور بہت کچھ دکھ بھی اس کے لیے اٹھائے۔ تم بھلا اس وقت کہاں تھے۔ روزانہ شیو کی مورتی اپنے ہاتھ سے بناتی اور اس کو پوجتی تھی اور پھر تمہارے باپ آ کر غصے سے اس کو اٹھاتے اور پھینک دیتے۔(4)

آنند موئی کے شوہر اس وقت کٹر ہندو نہیں تھے۔ وہ ہندو رسم و رواج کی بھی اتنی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ آنند موئی نے مزید بتایا:

"اس زمانے میں تو ہر ایک برہمن کے ہاتھ کے پکائے ہوئے چاول تک نہیں کھاتی تھی۔ میرے سات پشتوں کی جو روایتیں انھوں نے ایک ایک کر کے اکھیڑ ڈالیں۔ تو اب تم کیا سمجھتے ہو کہ وہ ایک دن میں پھر جڑ پکڑ جائیں گی۔"(5)

آنند موئی ذات پات کا فرق نہیں کرتی۔ اس نے اپنی مدد کے لیے ایک عیسائی عورت کو ملازم رکھا ہوا تھا جو گھر کے روز مرہ کاموں میں اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ آنند موئی جب گورا کے دوست بنوئے کو اپنے کمرے میں کھانے کے لیے لے جانا چاہتی ہیں تو گورا محض اس لیے منع کرتا ہے کہ گھر کی نوکرانی عیسائی خاتون ہے۔ معاشرے میں مذہب کی بنا پر تقسیم نوآبادکار کرتا ہے۔ گورا آنند موئی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے:

"میں ضرور اس بات پر اصرار کروں گا جب تک آپ اس عیسائن عورت کو نوکر رکھے رہیں گی، کوئی آپ کے کمرے میں کیسے آئے گا"۔(6)

گورا کا موقف یہ ہے کہ عیسائی عورت کے کمرے میں جانے سے کمرہ ناپاک ہو جاتا ہے۔ اس لیے بنوئے اور گورا اس کمرے میں نہیں جائیں گے۔ اسی ناول میں ذات پات کے اختلاف کو آنند موئی ان الفاظ میں رد کرتی ہے:

"اگر بلی تمہارے پاس بیٹھے اور پاس بیٹھ کر کھائے پیئے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن اگر ایک انسان اتنا بھی کرے کہ صرف کمرے کے اندر آجائے تو کھانا گندہ ہو جاتا ہے اور اسے پھینک دینا چاہیے۔"(7)

درحقیقت، کثیر الثقافت ہونا اور ثقافتی فرق ہونا میں بڑا فرق ہے۔ کثیر الثقافت معاشرہ کسی بھی ریاست کے لیے ایک قیمتی نعمت ہے، کیونکہ دنیا کے تقریباً ہر خطے یا ملک میں بیک وقت کئی ثقافتیں پروان چڑھتی ہیں۔ جبکہ ثقافتی فرق کو نوآبادیاتی طاقتیں زبردستی نوآبادی باشندوں پر مسلط کرتی ہیں، اور یہ فرق لوگوں کے درمیان نفرت یا محبت پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ نوآبادیات ان ثقافتی اختلافات کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

ہومی کے بھابھا کے مطابق، نوآبادیاتی بیانیے میں ثقافتی فرق اپنی اہمیت کھو دیتا ہے کیونکہ ثقافتیں آپس میں بات چیت کرتی ہیں اور ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ اپنی شناخت کا ختم ہونا یا گم ہونا ایک المیہ بن جاتا ہے۔ ثقافتی فرق دو الگ الگ اور طے شدہ ثقافتوں کے درمیان واضح فرق نہیں ہوتا۔ ان کے مطابق ثقافتیں مسلسل تبدیلی کے عمل میں رہتی ہیں اور یہ ایک پیچیدہ، متحرک عمل ہوتا ہے۔ ہومی کے بھابھا نے اپنی تحاریر میں "تھرڈ سپیس" کی اصطلاح استعمال کی ہے، جس سے ان کی مراد یہ ہے کہ جب ثقافتیں آپس میں مکالمہ کرتی ہیں، تو کبھی کبھار ایسا خلا پیدا ہوتا ہے جو مکمل طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، اور اس خلا سے نئی ثقافتیں اور شناختیں جنم لیتی ہیں۔

نوآبادیاتی ادب میں ثقافتی فرق نوآبادیات اور نوآبادی باشندوں کی روایات واقدار کے آمیزش اور تصادم کو ظاہر کرتا ہے۔ دو ثقافتوں کا امتزاج "مخلوطیت" کہلاتا ہے۔ ثقافتی فرق کا مطالعہ ہمارے رشتہ کو ہماری روایات سے جوڑتا ہے، اور یہ نوآبادیاتی بیانیے کا حصہ ہوتا ہے جس کے ذریعے استعمار کار ہمیشہ استعمارزدہ باشندوں کے اذہان کو ان کی اپنی ثقافت سے دور کر دیتا ہے، جس کے نتیجے میں ایک مخلوط ثقافت سامنے آتی ہے۔ اس مخلوط ثقافت کے کلامیے کی بدولت نوآبادیات نوآبادی باشندوں پر حکومت کرتی ہے۔

نوآبادی باشندے نوآبادکار کے قریب رہنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ کچھ مراعات حاصل کر سکیں۔ اس مقصد کے لیے وہ ان کی ثقافت اور طریقوں کی نقل کرتے ہیں، لیکن ان نوآبادی باشندوں کو نہ تو ان کے اپنے لوگ اہمیت دیتے ہیں اور نہ ہی نوآبادکار انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور اپنے ناول "گورا" میں کلکتہ کے ایک مجسٹریٹ کی سالگرہ پارٹی کا ذکر کرتے ہیں۔ جب گورا سے اس پارٹی میں شرکت کا پوچھا گیا تو اس نے انکار کر دیا۔ اس پر ہرن بابو اور گورا کے درمیان بحث چھڑ گئی، اور گورا نے کہا کہ "ہم جیسے ہیں وہ بھی ہیں، مگر انگریزوں کی سوسائٹی میں گھسنے کے لیے خوشامد کرنا ہمارے لیے اور بھی شرم کی بات ہے۔ ہرن بابو گویا ہوئے:

"لیکن جو لوگ لائق اور روشن خیال ہیں وہ انگریزی سوسائٹی میں بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں جیسے ہمارے یہ دوست ہیں۔
ان کا مطلب پاریش بابو کے خاندان سے تھا"۔(8)

انگریز نو آبادی باشندوں کو ضرورت کے وقت استعمال تو کرتے تھے لیکن کبھی بھی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ اگر تھوڑی بہت عزت اور پذیرائی ہو بھی جائے تو دوسرے ہم وطنوں کی ذلت اور حقارت کو بڑھا دیتی ہے۔

نقل کے مضر اثرات سے گورا واقف ہے۔ وہ سچاریتا کو گوروں کی اندھی تقلید کرنے سے منع کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

"اگر ہم اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں کہ انگریز ہم سے زیادہ طاقت ور ہے اور ہم جب تک اس جیسے نہ ہو جائیں گے اس کا مقابلہ نہیں کر پائیں گے تو یہ ایک ایسی ناممکن بات ہے جو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ گوروں کی تقلید کر کے ہم ادھر کے رہیں گے نہ ادھر کے"۔(9)

مخلوطیت کے کچھ فوائد بھی ہیں۔ جب مختلف ثقافتیں اور تہذیبیں آپس میں بات چیت کرتی ہیں تو مذہبی رواداری پیدا ہوتی ہے، جو کسی بھی معاشرے کے لیے بہت اہم ہوتی ہے۔ برہمو سماج اور ہندوؤں کے درمیان واضح فرق ہے۔ برہمو سماج والے بت پرستی کو ناپسند کرتے ہیں، جبکہ ہندو بتوں اور مورتیوں کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ ربندر ناتھ ٹیگور اپنے ناول "گورا" میں برہمو سماج اور ہندو مذہب کے افراد کو ایک ہی چھت کے نیچے دکھاتے ہیں۔ ناول "گورا" میں سچاریتا، جو ایک برہمو خاندان میں پرورش پاتی ہے۔ جب اس کی خالہ ہری موہنی اس کے گھر آئیں تو برودا دیوی نے برہمن کو پانی بھرنے سے منع کر دیا۔ ہری موہنی کو معلوم ہوا کہ اس وجہ سے گھر میں جھگڑا ہو رہا ہے تو انھوں نے کھانا پکانا ہی چھوڑ دیا۔ سچاریتا نے اپنی خالہ سے کہا کہ اگر میں ان لوگوں کے ہاتھ کا چھوا ہوا کھانا چھوڑ دوں تو کیا آپ مجھے اپنی خدمت کرنے دیں گی؟ اس پر ہری موہنی بولی:

"نہیں بیٹی، تجھے تو ویسا کرنا چاہیے جیسے تجھے سکھایا گیا ہے۔ جس طرح تیری تعلیم اور تربیت کی گئی ہے، میری وجہ سے تو کیوں راستہ بدلے؟ تو میرے پاس ہے، میری گود میں ہے، بس اتنی ہی خوشی میرے لیے کافی ہے۔ پاریش بابو تیرے باپ ہیں، تیرے گُرو اور استاد ہیں، تجھے ان کے پڑھائے ہوئے سبق کا احترام کرنا چاہیے۔ خدا اسی سے خوش ہو گا"۔(10)

ہری موہنی ایک ہندو خاتون تھیں اور ہندو رسومات کے مطابق کم ذات کے ہاتھ کا کھانا پینا بالکل پسند نہیں کرتی تھیں۔ سچاریتا ایک ہندو ہونے کے ساتھ ساتھ ایک برہمو خاندان میں پرورش پا چکی تھی۔ لیکن جب سے اس کی خالہ ہری موہنی یہاں آئی تھیں، وہ بھی ہندو رسم و رواج کی پرواہ کرنے لگی تھی۔ آج جب وہ پاریش بابو کے گھر سے اپنے گھر اپنی خالہ کے ساتھ جا رہی تھی تو اس نے خالہ سے پاریش بابو کے خاندان کے ساتھ کھانا کھانے کی اجازت طلب کی، تو وہ خاموش ہو گئیں۔ انہیں یقین تھا کہ سچاریتا اس کے کہنے پر عمل کرے گی اور مذہبی عقائد کا پورا احترام کرے گی۔ سچاریتا نے کہا:

"بھگوان اس بات سے خوش ہو گا کیونکہ انھوں نے مجھے سب کے ساتھ آج کھانا کھانے کا حکم دیا ہے۔ اگر میں ان کا حکم نہیں بجا لاتی تو وہ بہت ناراض ہوں گے اور ان کا غصہ آپ کے غصہ سے کہیں زیادہ ہو گا"۔(11)

انسان معاشرتی اقداراور رسم ورواج کو ضرورت کے تحت بناتا اور ختم کرتا رہتا ہے۔ رسم ورواج پر ماضی کی چھاپ ہوتی ہے، اور مابعد نو آبادیاتی باشندے عموماً ان سے بغاوت نہیں کر سکتے۔

ہومی کے بھابھا کے مطابق دوجذبیت نو آبادیاتی بیانیے میں نو آبادکار اور نو آبادیات کے درمیان وہ تعلق ہوتا ہے جو بنیادی طور پر مفاہمت اور مزاحمت پر منحصر ہے۔ اسی لیے یہ تعلق "دوجذبیت" کہلاتا ہے۔ اس تعلق میں نو آبادیاتی باشندے نہ مکمل طور پر مزاحمت کرتے ہیں اور نہ ہی مفاہمت۔ یہ ایک نو آبادیاتی کلامیہ ہے جس کے تحت نو آبادکار اور نو آبادیات کی دنیا آپس میں جڑتی ہے، اور اس کلامیے سے دوجذبیت جنم لیتی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی حالت ہے جس میں بیک وقت کسی شخص یا چیز کے بارے میں متضاد جذبات اور خیالات پیدا ہو جاتے ہیں، جیسے محبت اور نفرت۔

نو آبادیاتی باشندے رسم ورواج اور سوچنے کی صلاحیتوں کے حوالے سے الجھن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ انگریزی آداب کی نقل تو کرتے ہیں، مگر یورپ کی اصل روح سے ناواقف رہتے ہیں۔ ان میں یورپ جیسی روشن خیالی اور علوم کے بارے میں تحقیقاتی سوچ نہیں پنپتی۔ ناصر عباس نیر اپنی کتاب "اردو ادب کی تشکیلِ جدید" میں دوجذبیت کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> "دوجذبیت، نفسی صورت حال ہے جو کسی ایک معروض کے سلسلے میں دو متضاد و متصادم جذبات و خیالات سے پیدا ہوتی ہے۔ دوجذبیت کی کم از کم تین حالتیں ہیں: مرتکز، منتشر اور متذبذب۔ یعنی اگر ایک ہی وقت میں کسی شے کے سلسلے میں محبت و نفرت ہو، اور دونوں میں یکساں شدت ہو تو یہ مرتکز حالت ہے، اور اگر کسی وقت تحسین کے خیالات اور کسی وقت تنقیص کے خیالات ہوں تو یہ دوجذبیت کی منتشر حالت ہے، کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کسی شے کی آرزو اور ترک کے جذبات ہم قرین (overlap) ہونے لگتے ہیں، اسے تذبذب کی حالت کہا جا سکتا ہے۔ (آخری دو حالتوں کو دُہرے شعور کا نام بھی دیا جا سکتا ہے)"۔ (12)

نو آبادی باشندے لاشعوری طور پر اپنے خیالات و جذبات سے متصادم ہو جاتے ہیں۔

دوجذبیت کے بغیر ہم نو آبادیاتی طاقتوں اور نو آبادی باشندوں کے مابین تعلقات کی پیچیدگیوں کو نہیں سمجھ سکتے اور نہ ہی ان بیانیوں سے آگاہ ہو سکتے ہیں جو نو آبادیات نے شروع کیے تھے۔ نو آبادیاتی باشندوں کی شخصیت دوجذبیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے فائدے کے لیے اپنی ہی کہی باتوں کی تردید کرتے ہیں اور بعض اوقات تو مذہبی قوانین کو بھی اپنی ضروریات اور مرضی کے مطابق بدلنے میں ہچکچاتے نہیں ہیں۔

برہمو سماج کے ہرن بابو کا موقف تھا کہ لڑکیوں کی شادی اٹھارہ سال سے قبل نہیں ہونی چاہیے۔ اس موقف کی تشہیر کے لیے وہ اخبارات میں کئی مضامین بھی لکھ چکے تھے، مگر جب انھوں نے سچاریتا کا رشتہ طلب کیا تو پاریش بابو نے یاد دلایا کہ آپ تو کہتے تھے کہ اٹھارہ سال سے قبل لڑکیوں کی شادی کرنا غلط ہے۔ اس پر ہرن بابو بڑی ڈھٹائی سے بولے:

> "جی ہاں۔ لیکن یہ اصول سچاریتا پر لاگو نہیں ہوتا کیونکہ اس کا ذہن اس کی عمر کے اعتبار سے بہت زیادہ نشوونما پا چکا ہے۔" (13)

نو آبادیاتی باشندے اپنی شخصیت میں کسی ایک رائے پر مستقل طور پر قائم نہیں رہ سکتے۔ کبھی وہ ایک رائے اپناتے ہیں اور کبھی دوسری رائے کے حق میں دلائل دیتے ہوئے اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اس طرح ان کی شخصیت دوہری ہو جاتی ہے۔ ربندر ناتھ ٹیگور اپنے ناول "گورا" میں ایسی ہی صورت حال پیش کرتے ہیں جب مجسٹریٹ کے گھر میں ڈراما پیش کرنے کے بارے میں لولتا بنوئے کو اس میں

کردار ادا کرنے کے لیے راضی کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ابتدائی طور پر بنوئے کا موقف یہ تھا کہ مجسٹریٹ کی خواہش پر اس کے گھر میں ڈراما پیش کرنا توہتک کی بات ہے، لیکن جب لولتا اسے دلائل دے کر راضی کر لیتی ہے، تو اس کی ذہنی کیفیت دوجذبیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ ربندر ناتھ ٹیگور اپنے ناول "گورا" میں لکھتے ہیں:

> "لیکن آج رات آنسو تھے کہ زبردستی اُمڈے چلے آتے تھے۔ بات کیا تھی؟ کیوں وہ بنوئے کو نشتر لگاتے رہنا چاہتی تھی اور پھر اسی نشتر سے خود کیوں مجروح ہو جاتی تھی۔ جب تک بنوئے ڈراما میں پارٹ لینے سے انکار کرتا رہا تب تک لولتا کا اصرار بڑھتا رہا لیکن جب وہ راضی ہو گیا تو اس کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ بنوئے نے پارٹ نہ کرنے کے سلسلے میں جو دلیلیں پیش کی تھیں اب وہ سب ایک ایک کر کے لولتا کے دماغ پر ہجوم کر آئی اور اسے اس بات سے سخت کوفت ہونے لگی کہ صرف اس کی درخواست پر بنوئے کو راضی نہ ہونا چاہیے تھا۔"(14)

گورا، کلکتہ شہر کے مضافات میں اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ پیدل گھومنے نکلا۔ اس کا مقصد غریب لوگوں کی زندگی کا مطالعہ کرنا اور انھیں کچھ شعور دینا تھا۔ چند ہی دنوں میں سب لوگ کوئی نہ کوئی ذاتی بہانہ بنا کر کلکتہ واپس لوٹ گئے، آخر میں گورا کا ایک ساتھی رام پتی بچ گیا۔ گورا اور اس کا دوست رام پتی ایک گاؤں گھوسی پورہ میں پہنچے۔ اس گاؤں میں سب مسلمان تھے، صرف ایک ہی گھر ہندو کا تھا جو پیشے کے اعتبار سے نائی تھا۔ نائی نے بتایا کہ گاؤں پر پولیس طرح طرح کے ظلم کرتی ہے اور ان مظالم کا ذمہ دار ایک ہندو، مادھو چٹرجی ہے۔ مادھو چٹرجی کے پاس پولیس انسپکٹر اور چند سپاہی ٹھہرے ہوئے تھے جو اکثر گاؤں والوں پر مظالم ڈھاتے رہتے تھے۔ گورا اس مادھو چٹرجی کے پاس پہنچا اور وہاں مادھو چٹرجی اور پولیس کو برا بھلا کہنے لگا۔ انسپکٹر نے گورا کو دوٹوک جواب دیا کہ سرکاری حکم کو پورا کرنے میں کوئی مداخلت نہ کی جائے۔ گورا نے کوئی جواب نہ دیا اور وہاں سے چلا آیا۔ مادھو چٹرجی گورا کے پیچھے آیا اور قریب آ کر بولا:

> "آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ بجا ہے جناب۔ ہم لوگوں کا کام سچ مچ قصائیوں کا ہے اور جو بدمعاش انسپکٹر پولیس ہے نہ اس کے تو پاس بیٹھنا گناہ ہے۔ میں نے بھی اس کم بخت کے ذریعے بڑے بڑے گناہ کروائے ہیں۔ اب کیا آپ کو بتاؤں۔ لیکن اب زیادہ دنوں کی بات نہیں ہے، چند برسوں میں اتنا کما لوں گا کہ اپنی بیٹی کی شادی کر سکوں۔ پھر میں اور میری بیوی سنیاس لے کر کاشی چلے جائیں گے۔"(15)

مادھو چٹرجی کی شخصیت دوجذبیت کا شکار ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ پہلے لوگوں کو لوٹ کر بہت سامال جمع کر لے تا کہ اس سے اپنی بیٹی کی شادی کر سکے۔ اس کا منصوبہ ہے کہ بیٹی کی شادی کے بعد وہ اور اس کی بیوی سنیاسی بن جائیں گے، یعنی پہلے جی بھر کے گناہ کر لوں گا، پھر توبہ کر کے بھگوان کا ذکر شروع کر دوں گا۔

مادھو چٹرجی نے گورا سے کہا کہ وہ واپس اس کے گھر چلے اور کچھ خدمت کا موقع دے۔ گورا نے واپس جانے سے منع کر دیا۔ تو مادھو کہنے لگا کہ کم از کم ایک عدد لالٹین ہی لے جائیں تا کہ رات کے وقت آپ کے کام آئے۔ مادھو جو نہی واپس لوٹا تو گورا آگے بڑھ گیا۔ مادھو واپس آ کر پولیس انسپکٹر سے بولا:

> "یہ شخص ضرور ہماری رپورٹ کرے گا دوست۔ اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو پہلے ہی کسی کو مجسٹریٹ صاحب کے پاس بھجوا دیتا"۔(16)

مادھو چٹر جی کی شخصیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ایک طرف تو سنیاس لینے کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف پولیس کو مشورہ دیتے ہیں کہ مجسٹریٹ کو خبر دار کیا جائے کہ کوئی شخص مقدمے کے گواہوں کو توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مادھو چٹر جی کو فیصلہ نہیں ہو رہا کہ اسے غریب کسانوں کی مدد کرنی چاہیے یا پولیس کی ناجائز مدد کرے، جوان غریب کسانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہی ہے۔ دوسری طرف، وہ گورا کی مہمان نوازی کرنا چاہتا ہے۔ جب گورا واپس آنے سے منع کرتا ہے تو وہ اسے لالٹین کا تحفہ دینا چاہتا ہے، لیکن گورا قبول نہیں کرتا۔ پھر وہ پولیس والوں کو کہہ کر گورا کی شکایت مجسٹریٹ کے پاس بھیج دیتا ہے، جس کے گورا کی زندگی میں کافی خطرناک نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔

بنوئے لولتا کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ بنوئے ایک ہندو ہے اور لولتا برہمو سماج کی رکن ہے۔ دونوں الگ الگ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ بنوئے کو یہ سوچ کر بھی حیرانی ہوتی ہے کہ اس کے اور لولتا کی محبت کے درمیان مذہب کی دیوار اجائے گی۔ ایک دن لولتا کی ماں بردوادیوی نے بنوئے کو بلا کر پوچھا کہ کیا وہ ہندو نہیں ہے۔ جب اس نے حقیقت کا اعتراف کر لیا تو اس سے پوچھا گیا کہ کیا وہ ہندو مذہب چھوڑنے پر تیار ہے۔ بنوئے نے انکار کیا تو بردوادیوی بولیں کہ پھر تم کیوں؟ اس سوال پر اس کے ذہن میں بیک وقت مختلف خیالات پیدا ہو گئے۔ وہ کوئی بھی واضح جواب دینے کی حالت میں نہیں تھا۔ ربندر ناتھ ٹیگور بنوئے کی دو جذبی کیفیت کو "گورا" میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اس ادھورے سوال کا وہ کوئی قطعی جواب دینے سے بالکل قاصر تھا۔ ایک مجرم کی طرح اس نے سر جھکا لیا۔ جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ ایک بات جو وہ ہر ایک سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ سورج سے، چاند سے، ہوا سے بھی، وہ یہاں ہر ایک کو معلوم ہو چکی تھی۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ پاریش بابو نہ جانے کیا خیال کرتے ہوں گے۔ لولتا نے نہ جانے کیا سوچا ہو گا اور سچاریتا نے کیا سمجھا ہو گا"۔(17)

نو آبادی باشندے اپنے ذہن میں کوئی واضح لائحہ عمل طے نہیں کر پاتے۔ وہ ششں و پنج کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایک بات کو درست سمجھتے ہیں اور کبھی دوسری بات کو۔ ان میں فیصلہ کرنے کی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ بنوئے ایک ہندو تھا اور لولتا ایک برہمو سماج کی رکن۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے بات کر کے مسائل کا حل تلاش کر سکتے تھے، لیکن بنوئے فیصلہ نہیں کر سکا کہ لولتا سے کس طرح بات کرے۔ اس لیے جب اس کا سامنا ہوا تو وہ نمسکار کر کے آگے بڑھ گیا۔ بنوئے لولتا سے محبت کرتا تھا، لیکن مذہب کی تفریق اس کے راستے میں اجاتی ہے۔ وہ اداسی کی حالت میں آنند موئی کے پاس پہنچتا ہے۔ اس کے جذبات کی عکاسی ربندر ناتھ ٹیگور اپنے ناول "گورا" میں ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "بنوئے کے دل میں ہی کھٹکا تھا۔ اس کا کردار پاک وصاف ہے یا نہیں۔ اس بات کو وہ سمجھ ہی نہیں پایا تھا۔ لولتا ایک دوسرے سماج کی فرد ہے اور اس کے ساتھ اس کی شادی کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔ یہ سوچ کر اسے اپنی خاموش محبت ایک گناہ لگنے لگی"۔(18)

کار سرکار میں مداخلت کی وجہ سے مجسٹریٹ گورا کو ایک ماہ قید کی سزا سنا دیتا ہے۔ گورا جب قید سے رہا ہوتا ہے تو خود کو ناپاک تصور کرتا ہے۔ اس لیے وہ پر اشچت کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے والد کرشن دیال شدید مخالفت کرتے ہیں۔ کھانے پر جب آنند موئی نے بنوئے اور گورا کے آسن ساتھ ساتھ رکھے تو گورا بولا:

> "ماں بنوئے کا آسن ذرا دور کر دو۔
> آنند موئی حیران ہو کر بولی۔ "کیوں؟ بنوئے میں کیا خرابی ہے؟"

"خرابی بنوئے میں نہیں مجھ میں ہے، میں پوتر نہیں ہوں"۔
"کوئی حرج نہیں، بنوئے ایسی باتوں کی پرواہ کرنے والوں میں نہیں ہے"۔
گورا نے کہا۔ بنوئے چاہے نہ کرے، میں تو کروں گا"۔(19)

گورا کا کردار نو آبادی باشندے کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ ایک ماہ جیل میں گزار کر آتا ہے اور خود کو ناپاک سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے خیال میں پولیس والوں کے ساتھ کھانے پینے سے وہ ذہنی طور پر ناپاک ہو چکا ہے، جس کے لیے وہ باقاعدہ گنگا نہانے کا ارادہ کرتا ہے تا کہ اپنے آپ کو پاک کر سکے۔ جب بنوئے پاریش بابو کے ہاں آیا تو اس کا مذہب تبدیل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، لیکن اس کا ذہن مسلسل کئی دنوں سے کشمکش میں تھا۔ پاریش بابو نے اسے کہا کہ وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے۔ بنوئے نے سمجھا کہ شاید وہ اس کے ارادے کی پختگی کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ بنوئے نے کہا کہ وہ ہر صورت میں برہمو بننے کے لیے تیار ہے۔ اس کا ایمان پختہ نہیں تھا، بلکہ کسی بھی مذہب پر اس کا ایمان قائم نہیں تھا۔ اس نے کبھی یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ کون سا مذہب سچا ہے۔ پاریش بابو نے جب بنوئے سے مذہب پر یقین کے بارے میں سوال کیا، تو بنوئے نے جواب دیا:

"میں صرف اس دھرم کو سچا ثابت کرنے میں زور لگا تا رہا ہوں جس کے ساتھ رہ کر میری جیت ہو سکتی ہے۔ اس کی حمایت کرنے میں مجھے جتنی زیادہ محنت کرنی پڑتی مجھے اتنا ہی فخر بھی ہوتا۔ میں اب بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے اندر صحیح اور قدرتی طور پر دھرم وشواش موجود ہے یا نہیں۔"(20)

بنوئے کے بیان سے اس کی ذہنی کیفیت واضح ہوتی ہے کہ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا ہے کہ کیا درست ہے اور کیا غلط۔ اس کا ذہن دوجذبی کیفیت میں مبتلا ہے۔ جب پاریش بابو نے کہا کہ برہمو بننے کے لیے باقاعدہ درخواست دینی ہو گی، تو اس مقصد کے لیے بردوادیوی نے فوراً ہرن بابو کو بلالیا۔ بنوئے جس کا ارادہ ابھی تک پختہ تھا، صرف درخواست دینے کے خوف سے اپنا ارادہ بدل کر واپس ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر درخواست دی تو اس کی تشہیر ہو گی اور یہ بات گورا اور آنند موئی تک پہنچ جائے گی۔ حالانکہ اس کے برہمو سماج میں شامل ہونے کے بعد بھی یہ بات لوگوں سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ دوجذبیت نو آبادی باشندوں میں عام طور پر نظر آتی ہے۔ وہ وقت پر درست فیصلہ نہیں کر پاتے اور ان کی سوچ مسلسل معلق رہتی ہے۔ بنوئے نے پاریش بابو اور بردوادیوی کے سامنے برہمو بننے کا عندیہ دیا تھا، مگر گھر پہنچ کر اس کا ارادہ بدل گیا۔

"بنوئے جب تک برہمو سماج میں شامل ہونے کے معاملے کو معمولی طور پر دیکھتا رہا تب تک وہ بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنے ارادے کا اظہار کرتا رہا لیکن یہ دیکھ کر کے اس مقصد کے لیے برہمو سماج میں ایک باقاعدہ درخواست بھیجنی پڑے گی اور اس پر ہرن بابو کا مشورہ بھی طلب کیا جائے گا۔ وہ اس کی عام تشہیر سے خوف زدہ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائے۔ کس سے مشورہ کرے۔ اس بات کے لیے آنند موئی کے پاس جانا بھی اسے مشکل معلوم ہوتا تھا۔"(21)

نو آبادی باشندے اپنے فیصلوں پر زیادہ دیر قائم نہیں رہ پاتے یا بار بار فیصلے بدلتے رہتے ہیں۔ دراصل ان میں سوچنے، سمجھنے اور مستقبل کی پیشگوئی کرنے کی بصیرت کا شدید فقدان ہوتا ہے۔ بنوئے کے کردار میں دوجذبیت اس کی سوچ کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔ بردوادیوی ستیش کے ساتھ بنوئے کے گھر آتی ہیں اور اسے برہمو سماج میں شامل ہونے کے لیے درخواست لکھنے کو کہتی ہیں۔ بنوئے نہ چاہتے ہوئے بھی درخواست لکھ کر دے دیتا ہے، جسے بعد میں لولتا نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

ربندرناتھ ٹیگور کے ناول "گورا" کا مابعد نو آبادیاتی تناظر میں جائزہ برصغیر میں انگریزی حکمرانی کے سماجی، ثقافتی، اور مذہبی اثرات کو اجاگر کرتا ہے۔ناول میں نو آبادیاتی نظام کے تحت مقامی باشندوں کی مخلوط شناخت، ثقافتی فرق، اور دوجذبیت جیسے موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔ مختلف کردار، جیسے گورا، آنند موئی، اور پاریش بابو، نو آبادیاتی دباؤ اور ان سے پیدا ہونے والے شناختی بحران کو ظاہر کرتے ہیں۔ ہومی کے بھابھا کے تصورات، جیسے "نقالی" اور "مخلوطیت"، اس کہانی میں واضح ہیں، جہاں مغربی اور مقامی ثقافت کے درمیان تصادم انسانی رشتوں اور سماجی ڈھانچوں پر گہرے اثرات ڈالتا ہے۔ "گورا" نو آبادیاتی اثرات کی عکاسی کرتے ہوئے سماجی انصاف، انسانیت، اور مذہبی رواداری کا پیغام دیتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حواشی وحوالہ جات

1۔ روش ندیم،ڈاکٹر،دیباچہ مشمولہ "اردو ناول کا نو آبادیاتی مطالعہ "از ڈاکٹر ریاض ہمدانی،لاہور:فکشن ہاؤس،2018ء،ص13
2۔ ربندرناتھ ٹیگور،"گورا"،مترجم سجاد ظہیر،لاہور:تخلیقات،1997ء،ص19
3۔ ایضاً
4۔ ایضاً
5۔ ایضاً
6۔ ایضاً
7۔ ایضاً
8۔ ایضاً،ص161
9۔ ایضاً،ص166
10۔ اایضاً،ص315
11۔ ایضاً،ص361
12۔ ناصر عباس نیر،"اردو ادب کی تشکیل جدید"،کراچی:آکسفورڈ یونیورسٹی پریس،2016ء،ص324
13۔ ربندرناتھ ٹیگور،"گورا"،ص124
14۔ ایضا،ص185
15۔ ایضا،ص224
16۔ ایضا،ص129
17۔ ایضا،ص377
18۔ ایضا،ص381
19۔ ایضا،ص421
20۔ ایضا،ص453
21۔ ایضا،ص463

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Roman Havashi-o-Havalajat

1. Ravish Nadeem, Dr. Debacha Mashmoola, "Urdu Novel ka Nouabadiati Mutala", as Dr. Riaz Hamdani, Lahore: Fiction House, 2018, p.13
2. Rabinder Nath Tagore, "Gora", Mutarjim Sajjad Zaheer, Lahore: Takhleeqat, 1997, p.19
3. ibid, p.21
4. ibid,
5. ibid
6. ibid
7. ibid
8. ibid, p.161
9. ibid, p. 166
10. ibid, p. 315
11. ibid, p. 361
12. Nasir Abbas Nayyer, "Urdu Adab ki Tashkeel e Jadeed", Karachi: Oxford University Press, 2016, p.324
13. Rabinder Nath Tagore, "Gora", p.124
14. ibid, p.185
15. ibid, p.224
16. ibid, p. 129
17. ibid, p. 377
18. ibid, p. 381
19. ibid, p. 421
20. ibid, p. 453
21. ibid, p. 463